"مسلمان قوم ہیں یا فرقہ"

از جناب نذیر احمد صاحب قریشی۔ دہلی

ترجمان القرآن جلد ۱۱ عدد ۲ صفحہ ۹۵ تا ۱۴۴ پر ایک مضمون بعنوان "مسلمان قوم ہیں یا فرقہ" از جناب عزیز ہندی شائع ہوا ہے، جسکے پڑھنے سے مجھے کچھ شبہات اور اعتراضات پیدا ہو گئے ہیں۔ چونکہ یہ خالص علمی اور بہت ہی مفید بحث ہے اس لیے میں اپنے اعتراضات کو ذیل میں درج کرتا ہوں۔

جناب عزیز ہندی نے نہایت صاف طور پر اپنا موضوع لکھ دیا ہے کہ "مسلمان قوم ہیں یا فرقہ" اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ مسلمان قوم ہیں نہ کہ فرقہ۔ اس نتیجہ سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر "قوم" ثابت کرنے کیلیے جو استدلال انھوں نے پیش کیا ہے ہمیں علمی حیثیت سے اس پر اعتراضات ہیں۔

مضمون عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ "قوم" کا مفہوم یورپ کی اصطلاح "نیشن" سے لیا گیا ہے۔ سیاسی مسائل میں شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ہو جیسا کہ مسئلہ "قومیت" ہے جس پر اسقدر بے اصولانہ اور غیر مربوط فکر و تخیل پیش کیا جا رہا ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے ایسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا جا رہا ہے۔

(۱) فاضل مضمون نگار ایک قاعدہ کلیہ بیان فرماتے ہیں جو ذیل میں درج ہے۔

"اپنا الگ مسلک اور الگ طریق زندگی رکھنا ہی کسی جماعت کا ایک الگ قوم ہونا ہے"

"الگ مسلک" اور "ایک طریق زندگی" ایسے مہمل، مبہم اور گول مول الفاظ ہیں کہ ان سے کسی کلیہ یا اصول کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ان دونوں باتوں کے اجتماع سے "الگ قوم" بن جائے۔ ہم کوشش کرینگے کہ قوم کے اجزائے ترکیبی کو بیان کریں۔

"قوم" دراصل مرکب ہوتی ہے دو بڑے اجزاء سے۔ انمیں سے ایک اسکی حیثیت سیاسی ہے، دوسری کیفیتِ نفسی جو خاص خاص قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے، ترقی پاتی ہے اور زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ حیثیتِ سیاسی قوم کی تشکیل کے وجود کا ظہور خارجی ہے۔ اور کیفیتِ نفسی وجود اندرونی ہے۔

قوم کے سیاسی یا خارجی وجود کا تجزیہ اب ہم "نیشن" کی حیثیتِ سیاسی کا تجزیہ کرینگے تاکہ معلوم ہو سکے کہ "قوم" کے اجزائے ترکیبی میں ان کا دخل کہاں تک ہے۔ قوم چار قسم کی ہو سکتی ہے:

(الف) بسیط	(Simple)	
(ب) مخلوط	(Complex)	
(ج) مرکب	(Compound)	
(د) ممزوج	(Hybrid)	

(الف) بسیط قوم "نیشن" کا مکمل ترین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ اس سے مراد ہے وہ گروہ انسانی جسکی زبان، نسل، مذہب، تمدن اور جغرافی حدود ایک ہوں۔ اس قسم کی قوم کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ آئیس لینڈ میں اس قسم کی قوم آباد ہے، اور ملک حجاز کی تمام آبادی پر اسی قومیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اٹلی کے مشہور انقلابی لیڈر میزنی کا "نیشن"

کے متعلق یہی تخیل تھا۔

(ب) مخلوط سے مراد وہ گروہ انسانی ہے جسمیں مختلف فرقے، نسلیں، اور مذاہب کسی سیاسی مقصد کیلیے متحد ہو جائیں جسکی مثال انگلستان اور ہنگری ہے۔

(ج) مرکب سے ایسی قوم مراد لی جاتی ہے جسمیں کئی قومیں اپنی الگ قومی حیثیت رکھتی ہیں صرف وفاقی طور پر متحد ہوتی ہیں، جیسے آسٹریا (قبل از جنگ)۔ سوئیٹزرلینڈ۔ کینیڈا۔

(د) ممزوج سے انسانوں کا ایسا گروہ مراد ہے جو زبان، نسل اور جغرافی حدود کے الگ الگ ہونے کے باوجود کسی اپنے خاص واحد مذہبی نظام کے ماتحت متحد ہو، اور سیاسی طاقت کا بھی حامل ہو۔ یہی وہ قسم ہے جو مسلمان قوم کیلیے مخصوص ہے۔

انسانی جماعتوں کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کے جذب و اخذ کا بھی سوال پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ موضوع ہماری بحث سے خارج ہے اس لیے ہم اس کی تفصیلات میں نہیں پڑتے۔

قوم کی کیفیتِ نفسی کا تجزیہ "قوم" کا اندرونی وجود اسکی نفسی کیفیات ہیں جن کی تشریح علم النفس کے اہم موضوع "نفسیات اجتماع" سے ہو سکتی ہے۔ ذیل میں ان کا تجزیہ مختصراً کیا جاتا ہے۔

(۱) قانون اشتراکیتِ مسلسل (The law of continuous co-operation) جس کے ذریعہ سے مختلف وقتی عناصر ایک مقناطیسی قوت کے گرد جمع و متحد ہو جاتے ہیں۔ یہ قانون ایک قسم کی برقی رو کے ذریعہ تمام افراد قوم میں سرایت کر جاتا ہے اور اسی کے ماتحت جذبۂ اخوت پیدا ہو جاتا ہے۔

(۲) دوسرا قانون خطرات مشترکہ ہے (Commondanger) مذکورۂ بالا قانون کے تحت جو افراد باہم مربوط ہوتے ہیں ان کو مشترک خطرات سے حفاظت کا تخیل

اور زیادہ پیوست کر دیتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ حبِ وطن ایک بہت بڑی طاقت ہے اور "قومیت" اسی کی پیداوار ہے، لیکن اس کی بنیاد دراصل مشترک خطرہ ہی پر ہوتی ہے اس خطرہ سے حفاظت کا تخیل قوم میں سرایت کرتے ہی تیسرا نفسیاتی قانون کام کرنے لگتا ہے جو اسی کی پیداوار ہوتا ہے۔

(۳) اشتراکِ ایثاری (Sacrificial co-operation)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مشترک خطرہ پیش آنے پر تمام افراد قوم میں ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس جذبہ کا زور ان میں ایک زبردست اتصال پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ جب قوم اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے اور اپنے حدود خون کی لکیروں سے کھینچ لیتی ہے تو باقی تمام مدارج آسانی سے طے ہو جاتے ہیں[۱]۔

[۱] ترجمان القرآن۔ فاضل نقاد نے قوم کی کیفیاتِ نفسی کا یہ تجزیہ تمام تر مغربی مصنفین سے نقل کر لیا ہے، اور مغربی مصنفین پر جو مادّی نقطۂ نظر مستولی ہے اسی کو نادانستگی میں وہ بھی اختیار کر گئے ہیں۔ حالانکہ سب سے پہلے انہیں خود ان نظریات ہی پر تنقیدی نظر ڈالنی چاہیے تھی۔ اہل مغرب کے افکار میں یہ غلطی بطور اساس پائی جاتی ہے کہ وہ مادّی طاقتوں کو اصل اور روحی و نفسی طاقتوں کو فرع سمجھتے ہیں، اور ہمیشہ عالم باطن کی کیفیات کا سراغ عالم خارجی یا عالم مادّی کے محرکات ہی میں تلاش کیا کرتے ہیں۔ ان کے تمام نظریات اسی مادّہ پرستانہ رجحانِ نفس پر مبنی ہیں، اور یہ رجحان نفس فی نفسہٖ کوئی سائنٹفک حقیقت نہیں ہے جسکو چار و ناچار ماننا ہی پڑے، بلکہ یہ دراصل ایک غیر عقلی رجحان ہے جو دلیل کے بغیر پیدا ہوتا ہے، اور پھر اسکی تائید میں آثار و شواہد کو سائنٹفک طریقہ پر مرتب کر کے استدلال کی ایک نظر فریب عمارت کھڑی کر دی جاتی ہے جس سے آدمی مرعوب ہو کر یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ جو نظریہ پیش کیا جا رہا ہے وہ ایک حقیقت واقعیہ ہے۔ یہاں اسکی تفصیل کا موقع نہیں، مگر اشارۃً ہم صرف اتنا بیان کریں گے کہ قوم کے باطنی وجود کا جو تجزیہ کیا گیا ہے، مشاہدات اسکی

اب یوں سمجھئے کہ اگر سیاسی اجزائے ترکیبی قوم میں موجود ہوں مگر نفسی کیفیات پیدا نہ ہوں تو یہ ایک غیر کیمیاوی مرکب ہے جو کسی نہ کسی وقت الگ الگ اجزا میں تقسیم ہو کر رہیگا۔ یعنی جب تک نفسی کیفیات کی برقی رو قوم میں سرایت نہ کر جائے اسوقت تک صحیح معنوں میں مرکب طیار نہیں ہوتا۔ یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ سیاسی اور نفسیاتی اجزائے ترکیبی کے امتزاج طے کرتی چلی جائیگی۔ ان سب اسباب کے پیدا ہو جانے کے ساتھ قانون تغیر (Lam of change) بھی کام کرنے لگتا ہے، جسکے ماتحت یہ نفسیاتی کیفیات ترقی کرتی ہیں اور تنزل پذیر ہوتی ہیں اگر وہ تغیر رو بہ تنزل ہے تو قوم میں سے یہ خصائل زائل ہو جاتے ہیں، اور وہ اپنی آزادی کھو بیٹھتی ہے۔ ایسی مثالیں بہت ہیں کہ ایک نسل، ایک مذہب، ایک تمدن کی مالک اقوام اجنبی اقوام کی محکوم ہیں۔ اسلامی ممالک میں اس قسم کی مثالیں آپ کو کثرت سے ملینگی۔

مندرجہ بالا مختصر میں وضاحت سے یہ بات صاف ہو گئی کہ "الگ مسلک" اور الگ طریق زندگی" رکھنا کسی جماعت کو ایک الگ قوم نہیں بناتا بلکہ اور بھی ضروری عناصر ہیں جو "قوم" بنانے میں ممد و معاون ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵ - تائید نہیں کرتے۔ خود ہندوستان میں قانون اشتراک مسلسل، قانون خصوصات مشترکہ، اور قانون اشتراک ایثاری، تینوں کا عمل گذشتہ آٹھ صدیوں سے کام کرتا رہا ہے، اور مخلوط یا مرکب قومیت بنانے کیلیے بھی خارجی عناصر موجود رہے ہیں، مگر آج تک ہندو اور مسلمان کسی قسم کی بھی قوم نہ بن سکے۔ اس سے بڑھ کر کھلی ہوئی دلیل اس امر کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ قوم کے وجود ترکیب ان تین نفسیاتی قوانین کے عمل اور خارجی قوالب کی فراہمی سے نہیں ہوتی، بلکہ کوئی اور چیز بطور اساس اسکے اندر موجود ہوتی ہے جسکے لیے یہ چیزیں محض مددگار دین سکتی ہیں۔ جناب عزیز نے دراصل "الگ مسلک" اور الگ "طرز زندگی" سے اسی اساس کی طرف اشارہ کیا تھا، جسکو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ کسی گروہ کا ایک مستقل تہذیب، اور اس تہذیب کے زیر اثر ایک خاص تمدن رکھنا، اسکی قومیت کی (۵۶) اساس ہے۔

(۲) جناب عزیز ایک اور نظریہ پیش کرتے ہیں جو ذیل میں درج ہے:

"اقوام کا دفعتہً چولا بدل ڈالنا تاریخ، تجربہ انسانی، اور فطرت کے آئین کے بالکل خلاف ہے۔ اس لیے متعدد اقوام ہند کا محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا نہایت ہی غیر اغلب اور ناممکن ہے۔"

جہاں تک اس نظریہ کے پہلے حصہ کا تعلق ہے کہ "اقوام دفعتہً چولا نہیں بدلتیں" بالکل درست اور صحیح ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ فاضل مضمون نگار نے اس سے یہ نتیجہ کس طرح نکال لیا کہ متعدد اقوام ہند کا محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا غیر اغلب اور ناممکن ہے۔ برخلاف اس کے واقعہ یہ ہے کہ متعدد اقوام ہند کا ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا نہایت اغلب اور بہت ممکن ہے۔ ہم کہینگے کہ متحدہ قومیت میں ڈھالے جانیکا عمل ہندوستان میں بہت زور شور سے شروع ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے متحدہ قومیت پیدا ہوتے ہیں مقامی تعلق کی اہمیت کو نہیں سمجھا، اور دوسرے قوانین جو اس قومیت کے پیدا کرنے میں کام کرتے ہیں انکو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اسکو نظر انداز نہ کیجیے کہ "متحدہ قومیت" کا تخیل بھی یورپ کے سیاسی مفکرین کی جدید پیداوار ہے۔ ابتدائی زمانہ میں قوم کی بنیاد مختلف نسلوں اور جنسوں پر نہیں رکھی جاتی تھی، بلکہ قوم ایک ہی نسل کے مختلف قبیلوں اور گروہوں کے مجموعہ کا نام تھا۔ اور انسانوں کی قومیت وطن کی بنا پر تبدیل نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس زمانہ کا یہ عقیدہ تھا کہ ہر جانور جو شاہی اصطبل میں پیدا ہو یا پرورش پائے گھوڑا نہیں بن سکتا۔ جدید سائنس نے اس پرانے نظریہ کو تبدیل کر دیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے فلسفیوں نے جو نظریۂ قومیت پیش کیا تھا وہ بھی پرانا، فرسودہ اور بیکار سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کا قومی نظام بدل رہا ہے اور اب دنیا

ایک نیا چولا پہن رہی ہے - اٹھارویں صدی کے "نیشن" کے تخیل کی آخری شکست جنگِ عظیم سے ثابت ہے - ہندوستان کا سیاسی میلان یورپ کے جدید نظریہ "اسٹیٹ" کی طرف ہے۔ اس "اسٹیٹ" کی مذہب اور قدیم تمدن سے جنگ ہے - یہ "اسٹیٹ" وطنی قومیت کی بنیادوں پر کھڑی کی جارہی ہے - اسقدر تمہید کے بعد اب دیکھیے کہ متحدہ قومیت کن کن قوانین کے ماتحت کام کرتی ہے -

(۱) سب سے پہلے مختلف اقوام میں وطنی قومیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور مختلف اقوام ملک کی آزادی کی خاطر ایک سلسلہ میں منسلک ہوجاتی ہیں - اس قانون کا لازمی نتیجہ وطنی عصبیت کے جذبہ کا پیدا ہونا ہے - وہ تمام فرقے یا اقوام جو اس وطنی قومیت میں شامل نہیں ہوتے اُن کے خلاف وطنی تعصب پیدا ہوجاتا ہے اور ان کو ذلیل و خوار سمجھا جانے لگتا ہے - جیسا کہ ہم اوپر بیان کرآئے ہیں اس وطنی قومیت کی بنا بھی مشترکہ خطرہ ہے - اور اسکی انتہا دوسری اقوام پر حملہ کرنے کا جذبہ ہوتا ہے -

(۲) یہ ایک جارحانہ جذبہ (Aggressive Attitude) ہے - جو فرقے یا قومیں متحدہ قومیت کے دائرہ میں شامل نہیں ہوتیں ان پر ظلم کرنے کے خصائل متحدہ قومیت میں پیدا ہوجاتے ہیں اور یہ چیز بھی متحدہ قومیت پیدا کرنے میں مدد کرتی ہے، جیسا کہ روس میں ہوا -

(۳) تیسری چیز نفسیات ترغیب ہے - اور یہ حربہ نئی نسلوں پر استعمال کیا جاتا ہے - موجودہ نسل کو جارحانہ تدابیر سے مرعوب اور منکوب کردیا جاتا ہے تاکہ وہ دب کر رہ جائیں - اور آئندہ نسل کو ترغیبی تدابیر سے اس طرح متاثر کیا جاتا ہے کہ وہ متحدہ قومیت کی حامل بن کر اٹھیں -

(۴) چہارم قانون تغیر کا سب سے بڑا جزو "طاقت" ہے - اگر متحدہ قومیت کی تحریک طاقت کی مالک ہو تو وہ کمزور اقوام کو اپنے میں جذب کرلیگی - لیکن اگر مستقل قومیتیں طاقت ور ہوں

تو متحدہ قومیت کی تحریک فنا ہو جائیگی -

جب یہ چاروں اجزا تحریک آزادی کی بھٹی میں پگھلائے جاتے ہیں تو ایک نیا مرکب طیار ہو جاتا ہے جسکا نام متحدہ قومیت ہے - فلاسفہ کا خیال ہے کہ جب یہ چاروں عنصر کام کرنے لگتے ہیں تو تیسری پشت میں متحدہ قومیت پیدا ہو جائیگی جو پہلی اقوام سے بالکل ایک مختلف چیز ہو گی - ان قوانین کے جاری اور ساری ہو جانے پر ماحول اور دیگر اسباب کے مطابق ممکن ہے قسم (الف) کی قومیت قسم (ب) کی قومیت میں تبدیل ہو جائے اور (ب) (ج) میں تبدیل ہو جائے - اور یہ تغیر کچھ زیادہ عرصہ میں رونما نہیں ہوتا بلکہ بہت جلد عمل پذیر ہو جاتا ہے - البتہ (د) کی قسم میں تبدیلی ذرا دیر میں واقع ہوتی ہے جسکی مثال مسلمان قوم ہے - تاریخ سے ثابت ہے کہ اٹھارہویں صدی سے یورپ میں انقلابات رونما ہو رہے تھے اور یورپین اقوام ان کو جلد از جلد قبول کرتی جا رہی تھیں - لیکن عثمانی ترکوں میں ایک بہت بڑے عرصہ کے بعد یہ انقلاب اثر پذیر ہو سکا -

ذرا تاریخ عالم پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ امریکہ میں یونانی، اطالوی، فرانسیسی، جرمنی، بلغاری وغیرہ اقوام سے کس طرح امریکن قوم پیدا ہو گئی - یہ قوم صرف نفسیات ترغیب کے ذریعہ پیدا کی گئی ہے - امریکہ کے اسکولوں اور کالجوں میں نئی نسلوں کو متحدہ قومیت کی تعلیم دی گئی جہاں سے نئی نسلیں امریکن قومیت کا جامہ پہن کر نکلیں - ہندوستان میں بھی دو جدید تعلیمی اسکیمیں اسی مطلب کیلیے طیار کی گئی ہیں (ورد ھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم) -

اگر روس میں جہاں تقریباً ارڑتالیس مختلف اقوام آباد ہیں، اکثر اقوام کی مرضی کے خلاف متحدہ قومیت پیدا کی جا سکتی ہے تو وہ کونسی ایسی رکاوٹیں ہیں جنکی وجہ سے ہندوستان میں جدید متحدہ قومیت پیدا کرنا غیر ممکن ہو - روس میں تعلیم اور جبر دونوں حربے استعمال کیے جا رہے ہیں،

اور یہاں بھی متحدہ قومیت کی تحریک، حکومت کے اقتدار سے مسلح ہو کر انہی حربوں کو استعمال کر سکتی ہے اور کر رہی ہے۔

میرے ان خیالات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں متحدہ قومیت کا حامی ہوں سوال صرف یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگرس جس نوعیت اور طریق سے ملکی آزادی کے عجان پر سے مسلمانوں کو متحدہ قومیت کا شکار بنا رہی ہے اس سے بچنے کا کیا طریقہ ہے۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ متحدہ قومیت بننا غیر ممکن ہے تو ہم مطمئن ہو کر بیٹھ جائینگے۔ اور اگر یہ جان لیں کہ متحدہ قومیت بنائی جا سکتی ہے، اور زمانۂ قریب میں ہماری اسلامی قومیت کا مٹ جانا اغلب ہے، تو البتہ ہم چوکنے ہو کر اس سے بچنے کی کوشش کرینگے۔

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں مسلمان قسم (د) کے تحت میں آتے ہیں، یعنی ان میں کسی نئے نظام کو فوراً تسلیم کر کے جلدی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ ہمیں اسکی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ہے آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم پر نظر ڈالیں آپ کو یہ اصول ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آئیگا سرسیدؒ کو بھی اسی اصول سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ مگر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ متحدہ قومیت میں شامل ہی نہیں ہو سکتے۔ ترکی اور ایران میں جو انقلابات ہوئے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی مدبرین اپنے قومی تحفظ کی مؤثر تدابیر عمل میں لائیں، ورنہ میرا خیال ہے کہ تیسری پشت میں مسلمان اس متحدہ قومیت ہی کے ایک جز ہو کر رہ جائینگے۔

(۳) فاضل مضمون نگار نے "نیشن" کے متعلق یورپ کا مستعمل نظریہ یوں بیان کیا ہے :۔

> "کیونکہ "نیشن" کی جو موجود تعریف یورپ میں مستعمل ہے اس کے لیے "اسٹیٹ" کا ہونا لازمی ہے۔ یعنی وہ صرف اسی مجموعۂ افراد کو "نیشن" کا نام دینگے جو اپنی "اسٹیٹ" کے اندر آزاد و خود مختار زندگی بسر کر رہی ہو"۔

یہ غلط فہمی "نیشن" اور "اسٹیٹ" کے فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ ایسی غلطیاں اکثر ان مصنفین سے ہوئی ہیں جو علم السیاست پر کافی عبور نہیں رکھتے۔ "نیشن" اور "اسٹیٹ" کے مفہوم کو خلط ملط کر دیا گیا ہے اور ایک کو دوسرے کا مترادف سمجھا گیا ہے۔ میں چند مثالیں اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلیے پیش کرتا ہوں۔ سکاٹش (باشندگان سکاٹ لینڈ) اور ویلش (باشندگان ویلز) "نیشن" ہیں لیکن "اسٹیٹ" نہیں ہیں۔ اسی طرح سے فینی (باشندگان فن لینڈ) قوم ہیں لیکن اسٹیٹ نہیں۔ آسٹریا ہنگری اسٹیٹ تھی مگر نیشن نہیں تھی۔ یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ یورپ میں "نیشن" کی مستعمل تعریف کی رو سے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی "اسٹیٹ" کے اندر خود مختار زندگی بسر کرے۔

ہمارے موضوع سے باہر ہے ورنہ ہم تفصیلاً "اسٹیٹ" کے تخیل کے ارتقائی مدارج بیان کرتے۔ لیکن اس جگہ نہایت اختصار کے ساتھ ہم "اسٹیٹ" کی توضیح کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ جب سے سماج کا ظہور ہوا اسی وقت سے "اسٹیٹ" کا تخیل بھی پیدا ہوا۔ افلاطون اور ارسطو نے اس نظریہ کو پیش کیا۔ سولہویں صدی عیسوی سے یورپ کے مختلف الخیال فلاسفہ اسکی حسب ضرورت تشریح کرتے رہے۔ "اسٹیٹ" کا جدید نظریہ ہیگل کے فلسفیانہ نظریہ "اسٹیٹ" کی توضیح سمجھی جاتی ہے۔ "اسٹیٹ" (سلطنت) ایک سیاسی ہستی کا نام ہے۔ یہ اصطلاح انسانوں کی اس جماعت کیلیے استعمال کی جاتی ہے جو کسی واحد نظام حکومت کے ماتحت ہو اور اُس جماعت کی حیثیت مختار یا ایجنٹ کی ہوتی ہے جو آئین کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ یہ آئین خواہ لکھا ہوا (Written.) ہو، جیسا کہ ممالک متحدہ امریکہ کا ہے یا بے لکھا (Unwritten.) ہو، جیسا کہ برطانیہ کا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ "اسٹیٹ" اور "نیشن" ایک ہی ہوں۔ "نیشن" کے اجزائے ترکیبی تمدن، جذبات، نسل اور زبان

وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔

(۴) ایک اور نظریہ جو فاضل مقالہ نگار نے پیش کیا ہے وہ یہ ہے :-

"کوئی "نیشن" کسی دوسری نیشن پر حکمراں نہیں ہو سکتی۔ یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ محکوم قوم پر لفظ "نیشن" کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ جیسا کہ اوپر کسی جگہ بیان ہو چکا ہے "نیشن صرف اسی مجموعہ افراد کو کہا جاتا ہے جو اپنی حدود کے اندر آزاد و خود مختار زندگی بسر کر رہے ہوں اور "اسٹیٹ" کے مظہر ہوں"

جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے "نیشن" کیلیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ "اسٹیٹ" کی بھی مظہر ہو۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ محکوم قوم پر لفظ "نیشن" کا اطلاق نہیں ہوتا تو پھر جناب عزیز ہندی مسلمانان ہند کو "نیشن" کس اصول کے ماتحت تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی تو محکوم ہیں ؟

فاضل مضمون نگار نے ایک بہت وسیع قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ "کوئی نیشن کسی دوسری نیشن پر حکمراں نہیں ہو سکتی" اور ساتھ ہی یہ بھی اضافہ فرما دیا کہ "یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے"۔ کیا میں فاضل مضمون نگار سے محض علمی معلومات کے اضافہ کی خاطر دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ یہ اصول کس جگہ طے ہوا اور کون کونسی اقوام نے اسکو تسلیم کر لیا ہے ؟ یا یہ محض سیاسی مفکرین کی خوش خیالیاں ہی ہیں ؟ جہانتک یورپ کی تاریخ کا تعلق ہے اور جس کسی نے بھی یورپ کی سیاسی اور آئینی تاریخ کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہے کہ یورپ کے سیاسی مدبرین نے کبھی اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اسکا مضحکہ اڑایا اور اسکی تذلیل کی۔ جنگِ عظیم کے بعد پریزیڈنٹ ولسن نے

جب اقوام عالم کے قصرِ آزادی کا بنیادی پتھر نصب کرنے کے لیئے یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا تو علم سیاست سے دلچسپی رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ برطانوی تدبر کے ہتھوڑے نے کس طرح اس قصرِ آزادی کی اینٹ سے اینٹ بجاکر اسکی خاکِ پریشان کو ورسیلز کی فضا میں اُڑا دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جناب عزیز نے ایک بہت ہی اہم اور دلچسپ بحث چھیڑ دی ہے جسکی تفصیلات میں جانے کے معنی یہ ہیں کہ اٹھارہویں صدی سے اسوقت تک کی یورپ کی سیاسی تاریخ کی چھان بین کی جائے۔ لیکن اس مختصر سے مضمون میں اسکی گنجائش کہاں! دیکھنا یہ ہے کہ یورپ نے آزاد نیشن کا جو تخیل پیش کیا ہے وہ کیا ہے؟ آیا یہ ایک نیشن دوسری نیشن کی آزادی کو برباد نہیں کریگی یا یہ کہ "میری نیشن"، "میرا ملک" آزاد ہو خواہ دوسروں کی آزادی یا دوسروں کا ملک برباد ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ایک قسم کے تاریخی واقعات سے دو مختلف نتائج نکال لیے جائیں۔ لیکن میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یورپ کی یہی تلقین رہی کہ "میری نیشن" اور "میرا ملک" ہی وہ فلسفہ ہے جو یورپ کے سیاسی مفکرین نے پیش کیا ہے۔ متقدمین فلاسفہ نے یہ تلقین کی کہ "میری قوم" سب سے افضل اور آزاد ہے، اور یہی سب سے زیادہ خداوند تعالیٰ کی رحمتوں کی حقدار ہے۔ متاخرین نے "نیشن" کے تخیل کو اتنا بڑھایا کہ خدا کو بھی پس پشت ڈال دیا اور صرف نیشن ہی نیشن باقی رہ گئی۔ اسکی مثال میں ہم مختصر طور پر مختلف ممالک کے مصنفین کے نظریے پیش کرتے ہیں۔

ملٹن (Milton .) کہتا ہے "خدا نے اپنی انگریز قوم کو سب سے پہلے اپنی ہستی سے روشناس کرایا"

نارتھ کلف (Northcliff.) کہتا ہے "حکومت کرنا برطانیہ کا حق ہے"۔

امریکن کہتے ہیں "امریکہ خدا کا اپنا ملک ہے"۔

میزنی (Mazzini) کہتا ہے "اٹلی ہی مذہب ہے"۔

گیسٹن ری ایو (Gaston Riou) کہتا ہے "غیر فانی فرانس، انسانی حقوق کا علم بردار ہے"۔

جرمنی سے آواز آتی ہے "ہم ہیں مقدس قوم۔ ہماری قوم دنیا کی تمام قومیتوں کی جڑ بنیاد ہے"۔

روس پکارنے لگا "قومیت ہی خدا ہے"۔

غرضکہ سرزمین یورپ کی ہر قوم نے اپنی آزادی کا نقارہ بجایا مگر دوسروں کی آزادی کو آزادی بالکل نہ سمجھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ یورپ کی ایک آزاد قوم دوسری قوم کی آزادی کو بے دریغ برباد کر دیتی ہے اور اسکو احساس بھی نہیں ہوتا کہ کسی قوم کی آزادی اس نے برباد کر ڈالی ہے۔

اب ہم چند تاریخی شواہد سے ثابت کرینگے کہ یہ اصول کہ "کوئی نیشن کسی دوسری نیشن پر حکمران نہیں ہو سکتی" کم از کم عملاً کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔

۱۷۸۹ء سے لیکر ۱۸۱۵ء تک یورپ کے سیاسی تخیل میں بہت تغیر رونما ہو چکا تھا۔ اس دور میں دو اصول بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیے گئے۔ پہلا یہ کہ حکومت رعایا کی مرضی کے موافق چلائی جائے۔ دوسرا یہ کہ انسانی حقوق کی تشریح اور مطالبہ کیا جائے۔ ان دونوں اصولوں کا اعلان امریکہ نے ۱۷۷۶ء میں اور فرانس نے ۱۷۸۹ء میں کیا۔ حقوق انسانی کا سوال "نیشن" کے مسئلہ سے ملحق ہے۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ عملاً اسکے بعد کیا ہوا۔

۱۸۱۵ء کی ویئنا کی کانگرس میں "نیشن" کے اصولوں کو انگلستان نے کچل کر رکھ دیا۔ آئرش قوم کی آزادی کے مسئلہ کو کرامویل نے اسکا سر کچل کر حل کیا۔ اور ۱۸۴۸ء میں آئرلینڈ کی آزادی کو بے دریغانہ تباہ کیا گیا۔

۱۸۵۶ء کی کانگرس میں "نیشن" کا مسئلہ فرانس کی طرف سے پیش ہوا مگر پھر انگلستان نے اسکو رد کر دیا۔

۱۸۷۹ء کی برلن کانگرس میں رومانیا، سربیا، مانٹی نیگرو کو ظاہری طور پر ترکی سے آزاد کرایا گیا مگر اسی کانگرس میں بوسینا اور ہرزیگووینا کو آسٹریا کے ماتحت کیا گیا اور قبرس کو برطانیہ کے ماتحت۔

۱۸۸۲ء میں مصر کی آزادی کو برطانیہ نے برباد کیا۔

انگلستان نے "نیشن" کے تخیل کا جس حربہ سے مقابلہ کیا وہ توازن قوت (Balance of Power) کا مسئلہ تھا۔

۱۹۱۹ء کی جنگِ عظیم اور ورسیلز کے صلح نامہ نے فیصلہ کر دیا کہ نیشن کے تخیل کو شکست ہوئی۔

۱۸۱۵ء سے ۱۹۱۴ء تک کے تمام واقعات دیکھ لیجئے۔ ان میں سیاسی مفکرین کے تخیل "نیشن" اور سیاسی مدبرین کے تخیل "شہنشاہیت" میں جنگ نظر آتی ہے، جسکا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ نیشن کے تخیل کو شکست ہوئی۔ آپ دیکھینگے کہ اسی دور میں ایک طرف تو یونان، بلقان وغیرہ کو ترکی سے آزادی دلوائی جاتی ہے مگر دوسری طرف فرانس جو انسانی حقوق کا علمبردار بنتا ہے، الجزائر اور ٹیونس کی آزادی کو تباہ کر دیتا ہے۔ اٹلی خود اپنی آزادی کا علم بلند کرتا ہے اور طرابلس اور حبشہ کی آزادی کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ برطانیہ آزادی کا مدعی

بن کر اٹھتا ہے اور ہندوستان، مصر، فلسطین اور دیگر مشرقی ممالک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑتا نظر آتا ہے۔ جاپان کوریا اور چین کی آزادی کو چھین رہا ہے۔ مگر یہ سب کچھ "نیشن" اور "آزادنیشن" کے اصولوں کے تحت میں ہو رہا ہے۔ اگر واقعات کو واقعات کی بنا پر دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں یہ اصول کبھی تسلیم نہیں ہوا کہ "کوئی نیشن کسی دوسری نیشن پر حکمران نہیں ہو سکتی"، بلکہ مطلق العنان حکومتوں کو "قومیت" کا جامہ پہنا کر سامراجی کا بول بالا کیا گیا ہے۔ اور بالکل یہی چیز ہے جسکا اعادہ ہندوستان کی قومی کانگرس کمزور مسلمانوں پر "قومیت" کا کمبل ڈال کر کرنا چاہتی ہے۔

ہم نے خالص علمی حیثیت سے اس مضمون پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس مضمون میں اسقدر گنجائش نہیں ہے کہ ہم "نیشن" کے نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ کو زیادہ وضاحت سے بیان کریں کیونکہ ابھی بہت سے ایسے پہلو ہیں جنکو ہمیں نظر انداز کرنا پڑا ہے۔

جواب

از جناب عزیز ہندی

میں جناب نذیر احمد صاحب قریشی کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میرے مضمون "مسلمان قوم ہیں یا فرقہ" پر فاضلانہ تنقید فرما کر مجھے ایک بار پھر اس امر کا موقع دیا ہے کہ میں اس موضوع پر اپنے ناچیز خیالات کو ترجمان القرآن کے ذریعہ سے پیش کروں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اصل موضوع پر قلم اٹھاؤں میں یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مدیر صاحب ترجمان القرآن نے صرف چند صفحوں میں اپنا مطلب بیان کرنے کی اجازت دی ہے حالانکہ مضمون کی اہمیت کا تقاضا

یہ ہے کہ اس پر ایک مبسوط کتاب لکھی جائے۔ پس میں صرف اساسی بیانات پر اکتفا کرونگا۔ اسے پیشِ نظر رکھا جائے۔

دراصل مذکورۂ بالا مضمون میرے ایک پمفلٹ موسومہ "ہندوستان کے مسلمان کا نصب العین کیا ہے" کا ایک اقتباس ہے، اور چونکہ میری فکر کا پس منظر جناب نذیر احمد صاحب قریشی کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے اس لیے انہوں نے میرے بیان کردہ بعض نظریات کی غلط طور پر تعبیر کی ہے۔ پھر میں یہ حقیقت بھی اسی جگہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ جن کو وہ "میرے نظریے" کہتے ہیں، میرے نزدیک ان کی مستقل حیثیت ثابت نہیں۔ البتہ جس نظریہ کو میں پیش کر رہا ہوں یہ اس کی شاخیں (Offshoots) کہی جاسکتی ہیں۔

دوسری بات جسے میں شروع ہی میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے فاضل دوست نے تنقید کیلیے جو پہلو اختیار کیا ہے وہ سوائے چند ایک باتوں کے اس نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے جسے میں پیش کر رہا ہوں۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اعتراضات پر سلسلہ وار روشنی ڈالنا یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

(۱) وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک قاعدۂ کلیہ بیان کر رہا ہوں کہ

"اپنا الگ مسلک اور الگ طریقِ زندگی رکھنا ہی کسی جماعت کا ایک قوم ہونا ہے"

دراصل میں جس نظریہ کو دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی مجموعہ افراد اس وقت تک اپنے آپ کو قوم کے وجود میں نہیں ڈھال سکتا جس وقت تک کہ ان کی ذہنیت یا زاویۂ نگاہ کے اندر ایک قریبی مماثلت و مشابہت پیدا نہ ہو جائے خواہ ایسی مماثلت یا مشابہت نسلی بنا پر میسر آئی ہو، یا زبان، مقام یا ہم عقیدگی کی بنا پر پیدا ہوئی ہو۔ پس میں قوم کے وجود کیلیے "ذہنیت" کو مدارِ اولیں قرار دیتا ہوں۔ جن دو مجموعہ افراد کی ذہنیتیں مختلف ہیں ان کا مسلک

اور طریقِ زندگی کے لحاظ سے مختلف ہونا ایک طبیعی امر ہوگا۔ اب، ان کا مسلک و طریقِ زندگی کے اعتبار سے یہی اختلاف، ان کو امتیاز کے ساتھ آپس میں جدا کر رہا ہوگا اور وہ دو الگ الگ قومیں متصور ہونگی۔

اگر ذہنیت کے اس اختلاف کو ہم عمومیت کیساتھ آج یورپ پر منطبق کریں تو ہمیں یہ تسلیم کرنیکے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہیگا کہ یورپ تیزی کیساتھ دو بڑے محاذوں میں تقسیم ہو رہا ہے۔ ایک محاذ اشتراکیت کا ہے اور دوسرا سرمایہ داری کا۔ اب فرض کر لیجیے کہ جو مؤثرات (Factors) ان دو محاذوں کے وجود میں لانے کا باعث ہوئے ہیں، وہ اگر کسی تیسرے قوی تر مؤثر کو پیدا نہ کریں تو یہی مؤثرات ان مختلف اور متعدد قوموں کو جو سرمایہ دار اور اشتراکی دنیاؤں میں بس رہی ہیں، اندر ہی اندر بدلتے چلے جائینگے اور ان کی قومیتوں کی علحدہ حدودِ امتیاز کو مٹانا شروع کر دینگے، یعنی ایک طرف سرمایہ دار اقوام، اشتراکیت کے برخلاف، اپنی حفاظت و صیانت کیلیے زیادہ سے زیادہ متفق و متحد ہونا شروع ہونگی، اور دوسری طرف یہی ردِّ عمل اشتراکیت کے داخلی قواعد عناصر پر بھی واقع ہوگا۔ اس کے اجرار کی پہلی صورتِ حال یہ ہوگی کہ دونوں محاذوں پر ایک قسم کا وفاقی نظام پیدا ہوگا، جو اگرچہ ممالک کی موجودہ حدود و اقوام کو بحالہ قائم رہنے دیگا، لیکن انکی ملکی سیاست و سیادت کے موجودہ دائرے کو توڑ کر اسے وسیع تر کر دیگا۔ اور اگر یہاں بھی ان اقوام کو پناہ نہ مل سکی تو پھر وہ اسی وفاقی نظام کو ایک مرکزی نظام کی صورت میں تبدیل کر دینے پر مجبور ہو جائینگی۔ اور جب یہ چیز وقوع میں آجائیگی تو قوموں کا موجودہ امتیاز ناپید ہو جائیگا، اور ان مختلف و متعدد اقوام کے امتزاج سے جو قوم پیدا ہوگی وہ ایک نئی قوم ہوگی جسکا زاویۂ نگاہ، مسلک یا طریقِ زندگی، موجودہ یورپین اقوام سے یقیناً مختلف و متغائر ہوگا۔

نظام فطرت اپنے قانونِ امتداد و انقباض

کے ذریعہ سے اقوام کے ماحولی تغیرات و انقلابات پر اثر انداز ہوتا ہے، اور انہیں منقلب و تحلیل کرکے نئے نئے ناموں سے پیدا اور متعارف کرتا رہتا ہے۔ میرے دوست نے "قوم کے سیاسی یا خارجی وجود کے تجزیہ" کے ماتحت مجھے یہ بتلانے کی ناحق کاوش کی ہے کہ قوم چار قسم کی ہوتی ہے۔ اول بسیط (Simple)، دوم مخلوط (Complex) سوم مرکب (Compound) چہارم ممزوج (Hybrid.)

پہلے تو میں یہی نہ سمجھ سکا کہ "قوم کے سیاسی یا خارجی وجود" سے ان کا مطلب کیا ہے۔ "قوم" کی حیثیتِ سیاسی کا وجود میں آنا "قوم" کے بننے سے پہلے کس طرح ممکن ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ قوم مجرد بننے کے اپنا سیاسی یا خارجی وجود قائم کرلیتی ہے تو پھر یہ تسلیم کرلینا پڑیگا کہ قوم کا "خارجی یا سیاسی وجود" اس کی تشکیل کی فطرت میں مضمر (Inherent) ہے، اس لیے یہ کوئی الگ شے نہیں جو خارج از "وجودِ قوم" کسی ہئیت (Phase.) پر دلالت کررہا ہو۔ لہٰذا اس طرح قوم کی ہر تقسیم، خواہ وہ بسیط ہو یا مخلوط یا مرکب یا ممزوج بہرحال اس کا مدار اس ذہنیت پر منحصر اور موقوف ہوگا جس کی مماثلت اور مشابہت کی بنا پر اس کے جملہ عناصر ترکیب پائے ہیں۔ اب خواہ اسے بسیط یا مخلوط کہہ لو اور خواہ اسے مرکب یا ممزوج کا نام دے لو ؎

حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو کہ خاکی ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

آگے چل کر میرے دوست نے "قوم کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ" کرتے ہوئے قانونِ اشتراکِ مسلسل، قانونِ خطراتِ مشترکہ اور قانونِ اشتراکِ ایثاری کا حوالہ دے کر اس امر کو خود بخود تسلیم کرلیا ہے کہ

"اگر سیاسی اجزائے ترکیبی قوم میں موجود ہوں مگر نفسیاتی کیفیات پیدا نہ ہوں

تو یہ ایک غیر کیمیاوی مرکب ہوگا جو کسی نہ کسی وقت الگ الگ اجزاء میں تقسیم ہو کر رہیگا"

یعنی بالفاظ دیگر اگر کسی مجموعۂ افراد میں نفسیاتی کیفیات پیدا نہ ہوں تو نسل، زبان اور جغرافیائی حدود یہ سب مؤثرات (Factors) باہم مل کر بھی انہیں ایک قوم کی شکل وصورت میں متحد نہیں کر سکتے۔ اور اگر وہ کسی طرح بعض خاص حالات کے دباؤ کے ماتحت متحد ہو بھی گئے ہوں تو ایک وقت ان پر ایسا ضرور آئیگا کہ وہ باہم متفرق و پریشان ہو کر رہ جائینگے۔

یہاں میرے دوست خود میری ہی طرح، "ذہنیت" کو قوم کے وجود کی تشکیل و ترتیب کا مدار و اساس قرار دے رہے، اور چونکہ معلومات علم کی فراوانی کیساتھ ان میں توافق کی قوت (Power Assimilating) کم ہے اس لیے وہ اپنے تصور میں خود الجھ کر رہ گئے ہیں۔ وہ جسے قانون اشتراک مسلسل، قانون خطرات مشترکہ اور قانون اشتراک ایثاری وغیرہ کے مختلف ناموں سے گنوا رہے ہیں یہی تو دراصل "ذہنیت" کے وہ اجزاء متفرقہ ہیں جن سے اسکا قوام تیار ہوتا ہے[1]۔

[1] ترجمان القرآن۔ اشتراک مسلسل، خطرات مشترکہ اور اشتراک ایثاری دراصل ذہنیت کے اجزاء نہیں ہیں، بلکہ افراد کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے والے خارجی محرکات ہیں۔ اگر افراد میں تماثل ذہنی، یعنی اساس قومیت موجود ہے، تو یہ اسباب ان میں شدید اتصال پیدا کر کے ایک طاقت ور قومیت پیدا کر دینگے، اور اگر تماثل ذہنی موجود نہیں ہے تو یہ اسباب عارضی طور پر ان میں قربت اور تعاون تو پیدا کر سکتے ہیں، مگر جوڑ کر ایک قوم نہیں بنا سکتے۔ مشترک خطرات کے دفع ہوتے ہی ایک ایک جزء پھر الگ ہو جائیگا۔ دراصل ذہنیت کے اجزاء ترکیبی وہ امور ہیں جنکے مجموعہ کو ہم تہذیب کہتے ہیں، یعنی طریق فکر، نظریۂ حیات، معیار امتیاز و انتخاب یا معیار قدر (Standard of Values) اور وہ اصولِ زندگی جن کا ظہور مختلف تمدنی طریقوں میں ہوتا ہے۔ اسی چیز کا تماثل دراصل قومیت کا ہیولیٰ تیار کرتا ہے، اور اشتراک مسلسل وغیرہ اسباب محض اس ہیولیٰ کی صورت گری میں مددگار ہوتے ہیں۔ مختلف تہذیبیں رکھنے والی قوموں کو ملا کر ایک بسیط یا مرکب یا کسی اور قسم کی قوم بنا دینا ان

اب میں اپنے دوست سے کہہ سکتا ہوں کہ صرف ذہنیت ہی کی مماثلت و مشابہت سے قوموں کا وجود معرض ظہور میں آتا ہے، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود اس کی ازدیادی و امدادی قوتیں (Auxiliary Forces) ہیں اور بس۔

اب جس طرح قوم کی تشکیل کا مدار، اسکے افراد کی ذہنیت کی یکسانیت پر ہے اسیطرح خود ذہنیت کا مدارِ اولین وہ اعتقادات یا نظریات ہیں جو کسی مجموعۂ افراد میں عمومی طور پر پائے جاتے ہیں مگر ہم یہاں یہ بحث کرنے نہیں بیٹھینگے کہ یہ اعتقادات و نظریات، کسی مجموعۂ افراد میں کس طرح پیدا ہوئے اور اس میں نسل، زبان اور جغرافیائی حدود، ہر ایک کا کیا حصہ ہے۔

میرا یہ دعوے ہے کہ یورپ کے فلاسفہ اور سیاسی مفکرین صحت و وضاحت کیساتھ "قوم" کی اصل ترکیبی علت کو نہیں پا سکے، اور اس میں ان کا چنداں قصور بھی نہیں۔ یہ اس لیے کہ ان کا وہ فکری پس منظر جسے یورپ کی تاریخی روایات اور مخصوص ماحول نے ان کیلیے پیدا کر رکھا تھا، اس قدر الجھا ہوا تھا کہ وہ اصل حقیقت کو پا ہی نہ سکتے تھے۔ پس قوموں کے وجود و تشکیل کے متعلق میں جس نظریہ کو پیش کر رہا ہوں اسکا سراغ یورپین مصنفین کے افکار میں تلاش کرنا فضول ہے۔ میرے نظریہ کی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۰۔ اسباب کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ نتیجہ صرف اس صورت میں رونما ہوتا ہے جبکہ یا تو ان قوموں کی تہذیبوں میں کوئی اہم بنیادی اختلاف نہ ہو، یا ان کی تہذیبیں مستحکم ہو کر انکو مضبوط قومی صورتوں سے متصور نہ کر چکی ہوں، یا ان میں سے ایک قوم کی تہذیب اتنی طاقت ور ہو کہ مساویانہ اشتراک و تعاون کے دوران میں خود بخود وہ دوسری اقوام کی تہذیبوں کو مٹا دے اور ان کے دل و دماغ پر مستولی ہو جائے، یا پھر تعاون و اشتراک ایسا غیر مساویانہ ہو کہ ایک قوم تمام سیاسی و معاشی طاقتوں پر قابض ہو جائے اور باقی دوسری قوموں کو مغلوب کر کے زبردستی ان کی تہذیب کا استیصال کر دے۔ بہر حال خواہ کوئی صورت ہو، تبدیل ذہنیت، یا تغیرِ تہذیب کے بغیر ایک قوم کا دوسری قوم میں متبدل ہو جانا قطعاً ناممکن ہے۔

اساس "ذہنیت" پر ہے۔ افراد "ذہنیت" کی یکسانیت سے قوم بنتے ہیں اور اسی کے اختلاف سے منتشر و پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ خود "ذہنیت" جس بنیاد پر قائم ہے وہ اشیاء و حقائق کے متعلق افراد کے اعتقادات و نظریات ہیں۔ اب جس نوع کی ذہنیت ہوگی اسی نوع کا مسلک و طریقِ زندگی ہوگا۔ پس میرا یہ کہنا کہ مسلک و طریقِ زندگی ہی کے اعتبار سے قومیں آپس میں الگ شناخت ہو سکتی ہیں، مہمل یا مبہم نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کی ایسی تاویل ہے جسے یورپ کے ماڈیئین آج اس وضاحت کیساتھ پیش نہیں کر سکے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

(۲) میرے دوست اپنے دوسرے اعتراض کے شروع میں میرا یہ فقرہ نقل کرتے ہیں:۔

"جناب عزیز ایک اور نظریہ پیش کرتے ہیں کہ اقوام کا دفعتہً چولا بدل ڈالنا تاریخ تجربہ انسانی اور فطرت کے آئین کے بالکل برخلاف ہے اس لیے متعدد اقوام ہند کا محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا نہایت ہی غیر اغلب اور ناممکن ہے۔"

پھر اس نظریے کے پہلے حصہ کو صحیح و درست قرار دے کر اس کے دوسرے حصہ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ:۔

"لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ متعدد اقوام ہند کا محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا غیر اغلب اور ناممکن کیوں ہے"؟

پھر وہ اس کو وقوع میں لانے والی چار قوتوں کا شمار کرتے ہیں: وطنی عصبیت۔ جارحانہ شدت۔ نفسیاتی ترغیب یا پروپیگنڈا۔ کمزور کا طاقتور کی تقلید کرنا۔ اور اس کے بعد وہ امریکہ

اور روس کی قومیتوں کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب وہاں یہ تبدیل ہیئت ممکن تھی تو یہاں ہندوستان میں یہ کیوں ممکن نہیں ؟

میں کہونگا کہ میرے دوست نے میرے مطلب کو سمجھا ہی نہیں حالانکہ وہ واضح ترین الفاظ میں تحریر ہے، اور پھر لطف یہ ہے کہ وہ اعتراضاً جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی تہ تک خود ان کی اپنی نظر بھی نہیں پہنچی !

میں نے زیرِ نظر فقرے میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی متعدد اقوام کا محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا نہایت ہی غیر اغلب اور ناممکن ہے۔

میرے دوست ہندوستان میں متعدد اقوام کے وجود کو تسلیم کر رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہ محض مقامی تعلق کی بنا پر ان کا ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا بالکل اغلب اور ممکن سمجھ رہے ہیں۔ کیا میں انکی فکر و نظر کی درستی کیلیے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ پھر کیوں محکومیت کے اس ڈیڑھ سو سالہ دور میں، اب تک ہندو مسلمان اور یہاں کی دیگر قومیں محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک نہ ہو گئیں ؟ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ دور دورِ محکومیت تھا اور انگریزوں کے غلبہ و مزاحمت کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا، تو پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس سے پہلے تقریباً ایک ہزار سالہ دور جب کہ خود مسلمان یہاں پر حکومت کر رہے تھے ایسا کس بنا پر نہ ہو سکا ؟ کیا اکبر نے اپنی "الٰہی پالیسی" کے ماتحت اس کیلیے کچھ کم زور صرف کیا تھا ؟ پس اپنے ہی وطن کی ان دو مثالوں سے ظاہر ہے کہ محض وطنی تعلق اس کے لیے سریع الحرکت طاقت (

) نہیں۔

ہاں جب آپ کہتے ہیں کہ پہلے وطنی عصبیت پیدا ہو اور پھر اس عصبیت کی بنا پر تشدد اور

مظالم کئے جائیں (جیسا کہ روس میں ہوا) اور اس کے ساتھ ہی پروپیگنڈا کے تمام حربے بھی کام میں لائے جائیں اور پھر ان سب کے علاوہ قانون تغیر (Law of Change.) بھی اپنا عمل دخل کرے تو البتہ آپ کسی متحدہ قومیت کی شکل دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن کیا یہ سب طاقتیں جنکو آپ نے اوپر گنوایا ہے نفسی تغیرات نہیں جنکے بغیر آپ خود تسلیم کر چکے ہیں کہ "قوم ایک غیر کیمیاوی مرکب ہے۔ جو کسی نہ کسی وقت الگ الگ اجزا میں تقسیم ہو کر رہ جائیگا"

آپ دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ان حربوں کی طاقت سے ہندوستان کی متعدد اقوام کی ذہنیت کو یورپ کے موجودہ نظریۂ وطنیت کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا جائے تو کسی وقت یہ ملک بھی امریکہ اور روس کے ممالک کی طرح متحدہ قومیت کا حامل ہو جائیگا۔

شاید ایسا ہی ہو لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان نفسی تغیرات کا تعلق براہ راست قوموں کی ذہنیت سے ہے یا محض کسی جگہ کے "مقامی تعلق" سے جسکی بنا پر میں ناممکن و غیر اغلب کا لفظ استعمال کر رہا ہوں؟

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میں اپنے نظریے میں کتنا صاف اور آپ اپنے بیان میں کس قدر الجھے ہوئے ہیں۔ اب آپ پر اس حقیقت کو بھی کھول دینا چاہیے کہ میں ہندوستان میں کسی متحدہ قومیت کے وقوع کو ناممکن اور غیر اغلب نہیں سمجھتا بلکہ میں نے جس چیز کو ناممکن اور غیر اغلب کہا ہے وہ یہاں کسی واحد قومیت کی پیداوار ہے۔

گو اب گنجائش نہیں کہ میں اس اعتراض پر مزید تفصیل کے ساتھ کچھ لکھوں تاہم میں اپنے دوست کو یہاں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ "متحدہ قومیت" اور "واحد قومیت" میں ایک بین فرق ہے۔ ہندو قوم یہاں متحدہ قومیت نہیں چاہتی جو الگ الگ قوموں کے اساس پر قائم ہو، بلکہ وہ یہاں واحد قومیت کے وجود کی تمنائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ قوموں کے امتیازی

نشانات کو مٹا کر انہیں ایک نئی قوم کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔

امریکہ یا سوئٹزرلینڈ کی مثالیں یہاں منطبق نہیں ہو سکتیں کیونکہ گو ان کی وفاقی اکائیوں (Federal Units) میں نسل و زبان کی مغایرت موجود ہے تاہم صدیوں سے ان کی فکر کا جو مادّی پس منظر بن چکا ہے اس میں یکسانیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ پس وہاں بھی ذہنیت کی یکسانیت ہے جو ان کو آپس میں متحد کیے ہوئے ہے نہ کہ مقامی تعلق۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ نازی جرمنی نے آسٹریا میں اس "مقامی تعلق" کی کیا گت بنائی ہے اور پھر آپ کھلے دیدوں آج زیکوسلاویکیا میں جرمن اقلیت کو پر پرزے نکالتے ہوئے نہیں دیکھ رہے؟ اب وہ مقامی تعلق کہاں ہے جو جرمن اقلیت کو زیکوسلاویکیا سے وابستہ کیے رکھیگا؟ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہنیت کا ذرا سا باہمی تفاوت بھی، اقوام کی متحدہ صنعت کے لیے برداشت کے قابل نہیں۔

پھر امریکہ میں وہاں کے اصلی باشندوں کی حالتِ زار پر بھی ایک نظر دوڑا لیجیے اور میری بات کی تصدیق کیجیے۔

(۳) آپ کا تیسرا اعتراض بھی سرتاپا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ میرے اس بیان کو کہ:

"نیشن کی جو موجودہ تعریف یورپ میں مستعمل ہے اس کے لیے "اسٹیٹ" کا ہونا لازمی ہے یعنی وہ صرف اسی مجموعۂ افراد کو نیشن کا نام دینگے جو اپنی "اسٹیٹ" کے اندر آزاد و خود مختار زندگی بسر کر رہی ہو"

اس بنا پر غلط قرار دے رہے ہیں کہ گویا میں نیشن کیلیے "اسٹیٹ" کا ہونا ہر حال میں لازمی قرار دے رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے تو اس مذکورۂ بالا اقتباس میں یورپ کی ان اقوام کی طرف اشارہ کیا ہے جنکے ہاتھ میں آج مظلوم اور پامال قوموں کی قسمت کی باگ ڈور ہے، اور میرا

دعوے یہ ہے کہ وہ محکوم اقوام کو "نیشن" کے لقب سے ملقب نہیں کرتے۔ اسی لطیف فرق کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ اگر سکاٹ لینڈ کے باشندے اب تک اپنے آپ کو "نیشن" کے اسم و لقب سے پکار رہے ہیں تو وہ بلاشبہ ایک محکوم نیشن ہیں جو انگریزوں کی محکومیت میں آئے ہوئے ہیں، اور وہ دن دور نہیں جب کہ وہ آئرلینڈ کی طرح، اپنی گذشتہ روایات کو از سرِ نو تازہ کرکے اپنی آزادی کیلیے انگلینڈ سے برسرِ جنگ ہونگے۔ لیکن اگر وہ ہمیشہ کیلیے اپنی موجودہ پوزیشن پر قانع ہوگئے ہیں اور اپنی گذشتہ روایاتِ جنگ آزادی کو ذہن سے بالکل خارج کرچکے ہیں تو یقیناً وہ اب نیشن نہیں رہے ہیں بلکہ نرے سکاچ یا ہائی لینڈر رہ گئے ہیں جن کی نسل گو علحدہ ہو، زبان کا تلفظ گو انگریزوں کی نسبت سے کرخت اور مردانہ ہو، مگر پھر بھی وہ نیشن نہیں کہلائینگے[1]۔ کیا آپ مجھے آئین انگلستان میں سے کوئی دفعہ ایسی دکھلا سکتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اہلِ سکاٹ لینڈ کو نیشن تسلیم کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں جگہ دی گئی ہے؟

پھر آپ کیا مجھے بتلا سکتے ہیں کہ جنگِ عظیم کے خاتمہ پر آسٹریا ہنگری کی سلطنت کو کیوں قائم نہ رہنے دیا گیا؟ جرمنی کو کیوں ٹکڑے ٹکڑے نہ کردیا گیا؟ ترکی کو صفحۂ ہستی سے کیوں نہ مٹا دیا گیا؟ اور دیگر چھوٹی بڑی کئی اسٹیٹس کو کیوں وجود میں لایا گیا؟ انتدابی (Mandatory) سسٹم کی جگہ فاتحین نے کیوں متعدد ممالک و حصص پر قبضۂ ملوکانہ یا الحاق کی پالیسی کو روا نہ رکھا؟ اگر آپ ان تمام واقعات کا علم و بصیرت کے ساتھ مطالعہ کرینگے تو آپ کو معلوم ہوجائیگا کہ یوروپین اقوام کا بیسوی صدی کے آغاز اور بالخصوص جنگ کے بعد یہی کچھ معمول رہا ہے جسے

[1] ترجمان القرآن۔ مدعا یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی قوم کو دبا لیتی ہے اور رکھا جانا چاہتی ہے تو وہ اسکو "قوم" کے نام سے موسوم نہیں کرتی، بلکہ اس سے یہ احساس دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے وہ ایک "قوم" ہے۔ دوسری طرف وہ قوم جو دب چکی ہو، اگر اپنے آپ کو ابھی تک قوم سمجھ رہی ہے، تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اس میں ابھی تک زندگی موجود ہے اور وہ ابھر سکتی ہے اور اگر اس نے خود ہی اپنے آپ کو قوم کہنا اور سمجھنا چھوڑ دیا ہے تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وہ غالب قوم کیلیے قابلِ ہضم غذا بن چکی ہے، اب اسکی زندگی کا اعادہ ممکن نہیں۔

میں نے اقتباس مذکورہ میں پیش کیا ہے۔ انگریزی سیاست نے یہودیوں تک کو جو اس کرۂ ارض پر تسبیح کے منتشر دانوں کی طرح سے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے نیشن کے طور پر تسلیم کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ ان کیلیے ایک "نیشنل ہوم" موجود کیا جائے، پھر اگر میں نے یہ کہا ہے کہ "اسٹیٹ" نیشن کی مظہر ہوتی ہے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ کیا روح جسم کے بغیر قائم رہ سکتی ہے اور کیا آپ یہودیوں کو جب کہ ان کا کوئی گھر نہ ہو نیشن تسلیم کرینگے؟ اگر آپ ایسا کرینگے تو پھر بتلائیے کہ اس کے عملی اظہار کی کیا صورت ہوگی؟

آپ کہتے ہیں کہ میں نے نیشن اور اسٹیٹ کو باہم مترادف سمجھ لیا ہے۔ کیا آپ روح اور جسم کو باہم مترادف سمجھتے ہیں؟ اگر نہیں تو یقیناً میں بھی نیشن اور اسٹیٹ کو دو مختلف حقیقتیں سمجھ رہا ہوں لیکن یہ ایسی ہیں کہ ایک کے بغیر دوسری قائم نہیں رہ سکتی۔

آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ "اسٹیٹ" کا جدید نظریہ ہیگل کے فلسفیانہ نظریۂ اسٹیٹ کی ایک توضیح سمجھی جاتی ہے جسکے ماتحت اسٹیٹ ایک سیاسی ہستی کا نام ہے۔ کیا میں اپنے عزیز دوست سے پوچھ سکتا ہوں کہ "سیاسی ہستی" کس وجود کی نمائندہ ہے؟ آپ کو اس سوال کا جو جواب حاصل ہو میں اسی کو نیشن کہتا ہوں۔

پس اب میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم "نیشن" اسی کو کہینگے جو اپنی ہستی کی اسٹیٹ کے ذریعہ سے مظہر ہو۔ یہ نیشن بسیط یا مخلوط بھی ہو سکتی ہے اور مرکب یا ممزوج بھی۔ مگر خواہ یہ کسی درجہ و قسم سے تعلق رکھے اس کی اساس ذہنیت کی یکسانیت پر ہوگی، مقامی تعلق پر نہیں۔

مگر یورپ کے فلاسفہ اور سیاسی مفکرین اس وضاحت کیساتھ اس حقیقت تک نہیں پہونچے تو اس کیلیے آپ مجھے مورد الزام نہ ٹھیرائیں اگر ایک بات جسے یورپ والوں نے بصراحت نہ سمجھا ہو اور وہ آپ کے ایک بھائی کی سمجھ میں آگئی ہو تو کیا آپ کیلیے یہ کوئی ذلت کی بات ہوگی؟

آپ اخیر میں کہتے ہیں کہ "نیشن کے اجزائے ترکیبی تمدن، جذبات، نسل اور زبان وغیرہ ہوسکتے ہیں۔ اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی کو ان سے کوئی تعلق نہیں"۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی آپ کے نزدیک کیا ہیں؟ کیا یہ اجزائے ترکیبی نیشن کی بجائے کسی اسٹیٹ کے جنگل، پہاڑ، ہنر اور دریا تو نہیں!

(۴)

(۴) میرے دوست کا چوتھا اعتراض میرے مضمون کے مندرجۂ ذیل اقتباس کے متعلق ہے:۔

"کوئی نیشن کسی دوسری نیشن پر حکمراں نہیں ہوسکتی" یہ اصول تسلیم کرلیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ محکوم اقوام پر لفظ "نیشن" کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، بلکہ جیسا کہ اوپر کسی جگہ بیان ہوچکا ہے "نیشن صرف اسی مجموعۂ افراد کو کہا جاتا ہے جو اپنی حدود کے اندر آزاد و خود مختار زندگی بسر کررہے ہوں اور اسٹیٹ کے مظہر ہوں"۔

اس اقتباس کو نقل کرنیکے بعد وہ کہتے ہیں کہ "اگر اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے کہ محکوم قوم پر لفظ "نیشن" کا اطلاق نہیں ہوتا تو پھر جناب عزیز ہندی مسلمانان ہند کو "نیشن" کس اصول کے ماتحت تسلیم کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی تو محکوم ہیں؟"

میں اپنے دوست سے استدعا کرونگا کہ وہ میرے مضمون کو ایک دفعہ از سر نو پڑھ لیں میں نے اسی مضمون میں یہ وضاحت کیساتھ بیان کردیا ہے کہ انگریز جو کہ ایک حکمران نیشن ہیں "ہم کو نیشن" کے اسم و لقب سے نہیں پکارتے بلکہ ہمیں کمیونٹیز کہتے ہیں، لہذا اس مذکورۂ بالا اصول کے ماتحت انگریزوں کے زاویۂ نگاہ سے تو یقیناً ہم کمیونٹیز ہی ہیں، لیکن ہمارا زاویۂ نگاہ اپنے متعلق یہ نہیں ہے، ہمیں اگر ان کے زاویۂ نگاہ کو غلط قرار دیکر کمیونٹی سے نیشن بننا ہے تو ہم اپنے لیے نیشن ہونے کا ہی دعویٰ کرینگے۔ کیونکہ اسی بنا پر ہم اپنی آزادی کا مطالبہ پیش

کر سکتے ہیں۔

میں مسلمانان ہند کو "نیشن" تسلیم نہیں کرتا، میں تو ان کے نیشن ہونے کے دعوے کو تسلیم کرتا ہوں، کیونکہ میں اسی بنا پر ان کی آزادی کا مطالبہ کر سکتا ہوں۔ اور یہ وہی اصول ہے جسے میرا دوست "میری نیشن" "میرا ملک" کے مغربی نعرے (Siocan) میں مضمر دیکھ رہا ہے، میں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ کوئی نیشن کسی دوسری نیشن کے ہاتھوں مغلوب ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو تنازع للبقا اور بقائے اصلح کے قوانین فطرت کے ماتحت واقع ہونا لازم اور اٹل ہے لیکن اگر وہ محکوم ہونے پر اپنے نیشن ہونے کے دعوے سے دستبردار ہو جاتی ہے تو پھر یقیناً وہ نیشن نہ رہیگی۔ وہ جلد یا بدیر اپنی حاکم نیشن کے اندر مدغم ہو جائیگی اور یا یہودیوں کی طرح تتر بتر ہو جائیگی۔

ستم ہے کہ میرے دوست اصولی اور عملی حیثیتوں میں امتیاز نہیں کرتے۔ اگر ایک قوم کسی اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد اس سے انحراف کرتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے کبھی اس اصول کو تسلیم ہی نہ کیا تھا۔ یا یہ کہ اگر عمل اصول سے مختلف رہا ہے تو اسکے یہ معنی نہیں کہ "اصول" سرے سے موجود ہی نہ تھا، اور پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ خواہ کوئی ساعمل ہو رہا ہو اسکے موافق و مخالف اصول وضع و استخراج ہو سکتے ہیں جیسے تاریکی کے عمل سے تاریکی کا اصول (موافق) اور پھر تاریکی کے عمل سے روشنی کا اصول (مخالف) وھلمجرا۔

آخر میں میرے دوست متیقن ہیں کہ یورپ کی مطلق العنان اقوام و ممالک نے یہ اصول کہ کوئی نیشن کسی دوسری نیشن پر حکمران نہ ہو کہیں بھی تسلیم نہیں کیا۔ کیا میں اپنے دوست سے پوچھ سکتا ہوں کہ ترکی سلطنت کے حصہ بخرے کس بنا پر کیے گئے تھے، اور مانٹی نیگرو، سرویا، بلغاریہ اور رومانیہ وغیرہ کی "اسٹیٹس" کا ظہور کس طرح وجود میں آیا تھا؟ بلجیم اور سوئٹزرلینڈ کی خود مختاری اور آزادی کو قائم رکھنے کیلیے وہ کون سی اقوام تھیں جو آپس میں متعاہد ہوئی

تھیں؟ پولینڈ کے حق آزادی کا بار بار کن اقوام نے اعلان کیا تھا؟ حبشہ کی خود مختاری کو محفوظ رکھنے کا کس بین الاقوامی جمعیت نے بیڑا اٹھا رکھا تھا؟ اور وہ نو طاقتوں کا معاہدہ (Nine power Treaty) جسکے ذریعہ سے چین کی داخلی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی کیا بلا تھی؟

اگر میرے دوست کی ان حوالوں سے بھی تسلی نہ ہوئی تو پھر میں ان سے کہونگا کہ وہ جنگِ عالم کے خاتمہ پر "پیس تھیوری" کے ماتحت مختلف ممالک کے مدبرین و مفکرین سیاسی کے ان بیانات کو پڑھیں جو بالخصوص امریکہ اور یورپ کے اخبارات میں شائع ہوتے رہے تھے۔